ترقی پسند شعرا کا زاویۂ فکر اور انسان

ڈاکٹر طارق ہاشمی*

Abstract:

Progressive writers movement is an important chapter of urdu literature. The poets affiliated with this movment wer much impresed by marxist ideology and have depicted a social avareness in theire poetry. These poets presented a concept of man which is free from the limititation of social classes. These poets urged on that dignity of man which is crushed by upper class. they dreamed for a society where every man can enjoy all the blessings of God equally.

ترقی پسند تحریک، ادبی تحریک کے ساتھ ساتھ معاشیات کی اُس بڑی فکری روایت کے ساتھ بھی جڑی ہوئی تھی جس کے سوتے مارکس کے مادی جدلیات کے نظریے سے پھوٹتے ہیں۔ اس تحریک کے نظریہ سازوں نے انسان کی عصری صورتِ حال کی تفہیم کے لیے تاریخ اور اُس میں معیشت کی بنیاد پر طبقاتی کشمکش کو سمجھنے کی کوشش کی اور مستقبل کے لیے ایک ایسا نظامِ فکر تشکیل دیا جو موجود اور آئندہ نسلوں کی خوشحالی کی ضمانت دے۔

اس تحریک سے وابستہ شعرا نے اپنی شعری تخلیقات میں انسان کو تاریخ کے مذکورہ اقتصادی حقائق کی روشنی میں دیکھا اور خوشحالی کی اس امید کو نظم کیا جو کارل مارکس کی معاشی جدلیات کے نظریے میں انسانیت کو دلائی گئی تھی۔

اہلِ قلم کی اگرچہ ایک بہت بڑی تعداد ہے جو ترقی پسند تحریک کے منشور کے فروغ کے لیے کوشاں معاشرے میں عدل اور امن کے خواب دیکھ رہے تھے تاہم جوشؔ، فیضؔ، ظہیر کاشمیری اور احمد ندیم قاسمی ایسے شعرا ہیں جنھیں اہم نمائندہ آوازیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ گو کہ احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند تحریک کے فکری نظام کو پوری طرح اپنے باطن میں جذب نہیں کیا اور نہ ہی اول الذکر شعرا کی طرح اُن کے ہاں شعری ترفّع ہے لیکن یہ بات پورے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو نظم میں جن شعرا نے اپنی تخلیقات میں انسان پر اپنی خاص توجہ مرکوز کی اُن میں احمد ندیم قاسمی نمایاں ضرور ہیں۔

جدید اردو نظم کا ایک معتبر حوالہ قرار دیتے ہوئے جوشؔ کو معاصر تنقیدی رویوں نے ایک عرصہ بہت اہمیت

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

دی جس کے کئی ایک اسباب ہو سکتے ہیں۔اب بھی بعض مدّاحین ان کے سرمایۂ سخن کو عقیدت کی نظر دیکھتے ہیں لیکن اردو نظم کا جو منظر نامہ اب تشکیل پا چکا ہے اُس میں جوش کی تصویر کچھ زیادہ واضح نہیں۔

یہاں مقصد ان کے مقام و مرتبے کے تعین ہے نہ کسی بحث میں الجھاؤ بلکہ جدید اردو نظم میں انسان کے بارے میں جوش کے میلانات کی دریافت اور اُن کا تنقیدی جائزہ ہے۔ اِس حوالے سے اولین قابلِ ذکر نکتہ وہ فکری اختلاف ہے جو وہ اقبال کے حوالہ سے رکھتے ہیں یعنی اقبال کا مردِ مومن اپنی گونا گوں صفات اور قوتِ عمل کے باعث عروج و ارتقا کی منازل طے کرتا ہوا اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ ''گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان'' اور نوری نہاد و بندۂ مولا صفات بن جاتا ہے۔ پھر یہ انسان، کائنات میں نائبِ خدا بن کر انفس و آفاق پر اپنے وہ احکام صادر کرتا ہے جو مشیتِ ایزدی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم جوش کے تصورِ انسان کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ نہ صرف کائنات کا حاکم ہے بلکہ خدا سے بھی برابری کی سطح پر خطاب کرتا ہے۔ جوش کا انسان بندۂ مولا صفات نہیں ہے بلکہ خود اس کائنات کا مولا ہے۔ وہ نائبِ خدا نہیں ہے بلکہ 'خدا' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش 'لا الہ الا اللہ' کا ورد کرنے کے بجائے 'لا الہ الا الانسان' کا کلمہ پڑھتے اور پڑھواتے ہیں۔ جوش کے نزدیک:۔

آدمی، مسجودِ خیلِ قدسیاں   آدمی فرماں روائے این و آں
تشنگی آبِ حیواں آدمی   میرِ وقت و پیرِ دوراں آدمی
آدمی، شایانِ تسبیح و درود   آدمی، تفسیرِ آیاتِ وجود
انتہائے آدمی ہے داوری   ابتدائے آدمی، پیغمبری (۱)

اور کائنات کا یہ حاکم جب داوری کرتا ہے تو مسرور ہو کر یوں گویا ہوتا ہے:

شجر کانپتا ہے ، حجر کانپتا ہے   مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
دلِ سخت کوہ و کمر کانپتا ہے   مرے تیشۂ نو کی جھنکار سن کر (۲)

یہ نغمۂ داوری ظاہر کرتا ہے کہ انسان نے خدا کو معزول کر دیا ہے اور کائنات پر اپنی تاج پوشی کا اعلان کر چکا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ 'خدا' جسے انسان نے معزول کیا ہے۔ کون سا خدا ہے۔ کیا معزول ہونے والا خدا وہی ہے جو ذاتِ حق ہے اور اگر یہ خدا ذاتِ حق ہے تو وہ کون سا خدا ہے کہ جوش اپنی بعض منظومات میں جس کی حمد پڑھتے ہیں۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بحث جوش کے تصورِ الٰہ پر کی جائے۔ ظاہر ہے ایسے خدا کا انکار وہ نہیں کر سکتے کہ بقول جوش جس کے قبضے میں زمین و زماں ہیں اور اُس کی کرسی آسمانوں اور زمین تک پھیلی ہوئی ہے۔ تو پھر وہ خدا کون سا ہے جو معزول ہو کر 'شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا' ہو گیا ہے۔ دراصل جوش کا خدا کے بارے میں متشکّک کا رویہ ہے اور یہ تشکیک محض خدا پر ایمان کے حوالہ ہی سے نہیں بلکہ خدا کی تکفیر کو بھی وہ تشکیک سے دیکھتے ہیں۔ بقول سلیم احمد:

> ''کفر و ایمان دونوں پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور دونوں سے اپنے سوالات کا جواب طلب کرتا ہے۔''(۳)

جوش کے نزدیک خدا پر ایمان اور کفر دونوں تقلیدی رجحانات کے باعث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا خدا سے ''انکار بھی جہل اور اقرار بھی جہل''۔ جوش خدا کے بارے میں اسی جاہلانہ رویہ کے خلاف ہیں۔ لہٰذا وہ خدا کے بارے میں تمام تر روایتی تصورات کی نفی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بجا لکھا ہے کہ:

> ''جوش خدا کے روایتی تصوّر کے خلاف ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک انسان نے خدا کو بھی اپنی تنگ دل اور تنگ نظر ہستی کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اسی لیے وہ مولویوں پر خدا کے ساتھ کھیلے ہوئے کی پھبتی کہتے ہیں۔''(۴)

جوش جہاں خدا پر تنقید کرتے ہیں یا طنز و تعریض کا رویہ اپناتے ہیں تو وہ دراصل خدا کے اس مسخ شدہ تصور کا مذاق اڑاتے ہیں اور جس کے مقابلے میں انسان ایک عظیم ہستی ہے۔

جوش اپنی تشکیک کے باعث خدا کا کوئی واضح تصور نہیں دے سکے اور نہ ہی اس پر انہوں نے زیادہ گہری فکر کی ہے۔ البتہ انسان اُن کے نزدیک ایک ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو ارض و سما پر حکمرانی کے اہل ہے اور کائنات کا ہر ذرہ اُس کا تابع فرمان ہے۔ لہٰذا جوش انسان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کا ادراک حاصل کرے اور وہ تصورات جو بغض و عناد پر مبنی ہیں اُن کو ترک کرے اور لسان، ادیان اور اوطان کے زندانِ مثلث سے نکل کر امن و آشتی اور عشق و خلوص کے رویوں کو فروغ دے۔

جوشؔ نے انسان پر جو نظمیں کہی ہیں وہ بظاہر متضاد رویّوں کی حامل ہیں۔ ایک طرف انسان عظمتوں اور رفعتوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ تو دوسری طرف ذلتوں اور پستیوں میں گرا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر عقیل احمد:

> ''جوش ایک وقت میں کچھ نظر آتے ہیں اور دوسرے وقت میں کچھ۔ ایک طرف تو وہ انسان کی بالا دستی کے قائل ہیں، تو دوسری طرف اُسے مجبور تصور کرتے ہیں۔''(۵)

لیکن یہ جوش کا فکری تضاد نہیں ہے بلکہ جب وہ انسان کی عظمت کی بات کرتے ہیں تو یہ وہ انسان ہے جو عرفانِ ذات کے عمل سے گزر چکا ہے اور جس کی تعمیر جوش اپنے ذہن میں کر چکے ہیں اور جب وہ انسان کو اُس روپ میں دیکھتے ہیں کہ وہ پستی میں گرا ہوا ہے تو یہ وہ انسان ہے جس کا تعلق، جوش کے خارجی ماحول سے ہے اور جوش جس کے داخل میں انقلاب رونما کر کے اُسے اول الذکر انسان بنانا چاہتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنی بہت سی نظموں میں انسان کی جہالت پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور اُن رویوں کا ماتم کیا ہے جو اس جہالت کے باعث نشو و نما پا چکے ہیں۔

اب تک ہے علم و عقل و ہنر میں گھٹا ہوا — اب تک ہے بزمِ جہل میں ناداں ڈٹا ہوا
اب تک ہے خاکِ تیرہ میں انساں اٹا ہوا — اب تک لباسِ ذہن و ذکا ہے پھٹا ہوا
ہر چند خاکِ تیرہ سے بالا ہے آدمی(۶)

جوشؔ کے نزدیک انسان کی یہی جہالت ہے جس کی وجہ سے وہ حادثاتِ زمانہ کا شکار ہے۔ ورنہ انسان ان حادثات کو بھی روندنے کی قوت رکھتا ہے۔

کیا غم اگر زمین پہ وا ہے درِ ممات — پروا کسے جو آج ہے دن بھی سیاہ رات

یعنی بہ حکمِ دہر و بہ فرمانِ کائنات　　　انساں کو آج روند رہے ہیں یہ حادثات
کل ان کو جوشؔ روندنے والا ہے آدمی (۷)

اُن کے نزدیک آنے والے اس 'کل' کا انسان 'آج' کے جاہل انسان سے مختلف ہوگا۔ چنانچہ وہ نوعِ بشر کو جاگنے کا مسلسل پیغام دیتے ہیں۔

آفاق میں جو کچھ ہے وہ دانا کی نظر ہے　　　وجدان نہیں، عقل جہاں بین خضر ہے
دل مرکزِ اندیشہ، نہ ملجائے خبر ہے　　　انسان کی دولت ہے کوئی چیز تو سر ہے
اے نیند میں ڈوبے ہوئے انسان کے سر جاگ　　　اے نوعِ بشر، نوعِ بشر، نوعِ بشر جاگ (۸)

جوشؔ کے خیال میں انسان کا سر سورہا ہے۔ وہ اپنے دماغ کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار نہیں لانے دیتا۔ جوش انسان کو جاگنے کا پیغام دیتے ہیں۔ یہ بیداری دراصل اُس کے دماغ کی بیداری ہے کہ جب تک دماغ پر خواب طاری ہے انسان اسی طرح دکھ اور رنج کا شکار ہوتا رہے گا اور زندگی کی راہ میں ٹھوکریں اُس کا مقدر رہیں گی اور وہ مکدّر رہے گا۔ جوشؔ کے نزدیک انسانی عقل، مصائبِ کائنات کا مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ انسانی عقل کے سامنے کہکشائیں بھی گردِ راہ ہیں اور اسی قوت کی بدولت وہ افلاک کا حاکم ہے۔ قمر رئیس، جوش کے علمی و عقلی رویوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''جوش کا نظریہ علم حرکی، عملی اور ہمہ گیر ہے۔ انسانی تمدن کے ارتقا میں وہ اسی سائنسی علم کو کارفرما دیکھتے ہیں جو محنت اور اُس کے تجربات کا عطیہ ہے۔ اُس کے مقابلہ میں وہ جہالت، ضعیف الاعتقادی اور قدیم جامد علوم کو آدمیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔'' (۹)

جوشؔ کے یہ نظریات، جان لاک کے فلسفۂ تجربیت اور اگست کامتے کے اثباتیت کے خیالات کے بہت قریب ہیں کہ جن کی رو سے کائنات کے موجودات کا ادراک انسانی دماغ ہی کرسکتا ہے اور جو کچھ اس سے ماورا ہے وہ محض وہم و گمان ہے۔ جوشؔ بھی وجدان اور 'چراغِ آیات' کو راہنما تسلیم کرنے کے بجائے انسانی فکر اور نگاہِ تجسس کو اہمیت دیتے ہیں۔

رکاب تھام کے چل روحِ آدم ایجاد　　　چلا ہے علم، سوئے دشتِ جہل، بہرِ جہاد
دیارِ لات و جبل میں پکار کر کہدو　　　کہ ہورہا ہے بشر بندگی سے اب آزاد
وہ اک نگاہِ تجسس ہے سوئے ذات وصفات　　　سمجھ رہے ہیں جسے مفتیانِ دیں الحاد
غرض ہے علم سے اے جوشؔ، بت ملے کہ خدا　　　اٹھا بھی پردۂ اسرار، ہرچہ بادا باد (۱۰)

جوشؔ کی عقل پرستی کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے ماحول میں سوائے توہّم کے اور کچھ نظر آتا ہے اور یہی توہمات ہیں جو انسان کے لیے ایک بڑا زندان ہیں۔ جوشؔ اپنے ماحول کی توہم پرستی سے کس قدر بیزار ہیں۔ اس کا اندازہ اُن کی نظم ''مردوں کی دھوم'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس مذہبی توہم پرستی کے علاوہ انہیں وہم کی اور بہت سی

حالتیں ایسی نظر آتی ہیں جو انسان کے ذہن کو مغلوب کیے ہوئے ہیں۔

جوشؔ وہم کو 'دامِ باطل' قرار دیتے ہیں اور اُس قوت کو تلاشتے ہیں جو اس دام سے انسان کو آزاد کرے۔ یہ قوت فکر ہے جو نہ صرف انسان کو دامِ باطل سے آزاد کرتی ہے بلکہ اُس میں تسخیر کی قوت بھی آجاتی ہے۔

جوشؔ کے نزدیک، عقل ایک زبردست طاقت ہے جو آفاق پر چھا جاتی ہے۔ اس نظریہ پر غور کریں تو جوش کے ان خیالات میں نٹشے کے فلسفہ ارادیت کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ نٹشے کے نزدیک انسان کے پاس اتنی ہمہ گیر طاقت ہے کہ وہ کائنات کا کبریا بن سکتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں سے ہفت افلاک پر غالب آجاتا ہے۔ آفاق کا ذرہ ذرہ اُس کے ارادوں کا محکوم ہوتا ہے۔ انسان جو کچھ چاہے اپنے ارادے سے کر سکتا ہے۔ نٹشے کے خیال میں جو تغیرات اور انقلاب رونما ہوتے ہیں وہ دراصل انسان ہی کی قوتِ ارادی کے مرہونِ منت ہوتے ہیں زمین پر جو کچھ ہوتا ہے وہ اسی ارادے ہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

جوشؔ کی درج ذیل رباعی ملاحظہ ہو جس میں وہ انسانی ارادے ہی کو ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں اور انسان قوت کے حصول سے کائنات کا معبود بن جاتا ہے۔

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا دنیا نہیں کچھ نمودِ طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولا بن جا معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا (۱۱)

جوشؔ اس بات پر یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان ایک دن قوتِ ارادی کے ذریعے کائنات کا مولا ضرور بنے گا۔ آج یہ انسان ظلوم وجہول ضرور ہے۔ زمانہ موجود میں کائنات پر انسان سے بڑھ کر کوئی مظلوم نہیں، لیکن ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب انسان ظلوم وجہول نہیں رہے گا۔ اُس کے اردگرد چھائے ہوئے توہمات کے اندھیرے چھٹ جائیں گے۔ انسان زمین پر ایک مظلوم مخلوق کے بجائے 'زمین کا براق' بن جائے گا۔

ابھی نہیں، نہ سہی، کل یہ نعرہ گونجے گا کہ دہر کا ہے بشر قادر علی الاطلاق
مسیحِ وقت، بپئے حرفِ مرگ اے جوشؔ الٹ رہا ہے کتابِ حیات کے اوراق (۱۲)

جوشؔ 'جہادِ علم' میں بھی اسی ایقان کا اظہار کرتے ہیں:

اِس آدمی کو خدارا جواں تو ہونے دو مسیحِ وقت بنے گا یہ طفلکِ جلّاد (۱۳)

جوشؔ کے تصورِ انسان میں علمی ارتقا کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کے باعث وہ انسان میں مسیحِ وقت اور فطرت کا قانون ساز ہونے کی صلاحیت اجاگر ہوتے دیکھتا ہے۔ وہ اقبالؔ کے تصورِ عشق کے برعکس عقلی اور علمی ترقی کے موید ہیں۔ یہ الگ بات کہ جوش نے علمی ارتقا کی بات کرتے ہوئے سائنسی یا مادی پہلو پر کسی واضح فکری نظام کی بات نہیں کی صرف مخصوص بلند آہنگ اسلوب میں انسان کے مستقبل میں قادر علی الاطلاق ہونے کا اعلان کیا ہے۔

ترقی پسند شعرا میں فیض نے قدرے بعد میں اپنی شناخت قائم کی لیکن بعض معروضی حالات نے اُن کی اِس شناخت کو ایسا استحکام بخشا کہ وہ اس رجحان کے حامل شعرا امام خیال کیے جانے لگے۔ فیض کے یہاں 'انسان'

پر بحث کوئی فلسفیانہ اُپج نہیں رکھتی، نہ ہی انہوں نے اپنی نظم میں کسی ایسے فرد کا تصور پیش کیا ہے جو مستقبل میں موجود کی صورتِ حال میں کوئی تغیر رونما کرے۔ لیکن فیض نے مارکس کے جدلی مادیت کے نظریہ اور شخصی حکومتوں کے استبداد اور جمہوری اداروں کی مسلسل شکست وریخت کے باعث اپنی نظموں میں انسان کی طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کی تصویر کشی منفرد انداز میں کی ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے اپنے تصورِ انسان کو کسی فردِ واحد کے بجائے اجتماعی حوالہ سے ظاہر کیا ہے۔

فیض کے نزدیک ظالم اور جابر طبقے نے انسان سے اس کی آزادی چھین لی ہے اور اس کے امن وسکون کو غارت کر دیا ہے۔ اس طبقہ کے محدود مفادات کے باعث انسان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ مزدور، کسان، محنت کش، اور رزقِ حلال کمانے والے اپنے حقوق سے محروم ہیں اور امن و آزادی ان کے لیے محض ایک خواب بن گیا ہے۔ اس استحصالی طبقہ نے کوئی عصرِ حاضر میں جنم نہیں لیا۔ بلکہ ''انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب وتعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔''(۱۴)

آج تک سرخ وسیہ صدیوں کے سائے کے تلے آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟ (۱۵)

اسی طرح ''دستِ صبا'' کی ایک نظم میں کہتے ہیں:

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی (۱۶)

استبدادی طبقہ، معصوم انسانیت سے ان کی خوشیاں سلب کر لیتا ہے اور انہیں مختلف سرابوں میں بہلائے رکھتا ہے لیکن یہ کھیل محض اس وقت تک رہتا ہے جب تک معتوب طبقہ غفلت کا شکار رہے اور انہیں اس خواب سے بیدار کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ورنہ اس طبقہ کے پاس ایسی قوت موجود ہے کہ وہ ظالم اور جابر لوگوں کو نیست ونابود کر کے ان سے وہ سلوک کرے جو اُن کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ نظم ''کتے'' میں وہ علامتی پیرایۂ اظہار اختیار کرتے ہوئے مظلوم طبقے کی نہایت عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

اپنی نظم ''تین آوازیں'' میں وہ اسی یقین کا اظہار کرتے ہیں۔ اس نظم میں تین کردار ہیں جنہیں نام تو نہیں دیے گئے لیکن اُن کے مکالمے اُن کے خیالات بلکہ طبقے یا حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ یہ کردار سامنے بھی نہیں آتے۔ صرف آوازوں کی صورت میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں۔ نظم میں پہلی آواز ظالم کی ہے۔ یہ کردار اپنے مظالم کا نہ صرف اعلان کرتا ہے بلکہ اپنے کریہہ اعمال پر فخر بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے ظلم ہی کو قانونِ دنیا سمجھتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے:

فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہوا عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہوا (۱۷)

دوسری آواز مظلوم انسان کی ہے جو خدا سے فریاد اور شکوہ کرتا ہے۔ نظم کے آخر میں ''ندائے غیب'' کی

صورت میں ایک کردار ظاہر ہوتا ہے جو پہلے دو کرداروں کی آوازوں پر اپنا ردِ عمل یوں ظاہر کرتا ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو   کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں   پڑیں گے دارورسن کے لالے
کوئی نہ ہو گا کہ جو بچا لے   جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا   یہیں سے اٹھے گا روزِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا(۱۸)

فیض کے تصورِ انسان میں مساوات کا عنصر ایک بنیادی صفت ہے ۔طبقاتی تفریق کی نفی کرتے ہوئے وہ طبقہ جو انسان کو محروم رکھنا چاہتا ہے، فیض اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں۔اور محروم انسانوں کو پیغامِ وغا دیتے ہیں۔انہیں اپنے حقوق کے حصول کے لیے برسرِ پیکار ہونے کا درس دیتے ہیں۔ان کا یہ پیغام معاشرے کے ہر محروم انسان کے لیے ہے۔میجر محمد اسحاق کے الفاظ میں:

”فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں بھی گھس رہی ہیں۔جہاں کسانوں کے ساتھی مزدور، انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں۔فیض یہ سب کچھ خود ہی نہیں دیکھ رہے بلکہ۔۔۔۔دماغی مزدوری کرنے والے مصنفوں، کلرکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ماجھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ کارگہِ ہستی میں جو رَن پڑ رہا ہے۔اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پہچانو، ناداری، دفتر، بھوک اور غم نے چومکھ پتھراؤ کر کے تمہارے ساغرِ دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور تمہاری عزت و ناموس خاک میں ملا دی ہے۔“(۱۹)

فیض کے لینن امن انعام کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا تھا کہ انسان تسخیرِ کائنات کے عظیم فریضے کو انجام دیتا ہوا کہکشاؤں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔لہٰذا اس عظمت پر متمکن ہونے کے بعد طبقاتی تفریق اور اپنے مفادات کے حصول کی کوششیں کم تر حرکتیں ہیں۔فیض نے کہا:

”آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خودغرضیاں، یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں، تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو، یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو۔اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیرِ کائنات کو چلو جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے۔جہاں کسی کو کسی سے الجھنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں۔"(۲۰)

فیض کی شاعری میں انسان تاریخ کے تسلسل میں ظلم واستبداد کا شکار ہے مگر اپنے آئندہ سے مایوس نہیں بلکہ ایک زبردست جدلیاتی قوت کے حصول کے بعد عدل اور امن کی منزل کی طرف امید اور یقین کے ساتھ گامزن ہے۔

امن اور عدل کی منزل کی طرف رواں دواں ترقی پسند تحریک کے قافلے کا تیسرا اہم حوالہ ظہیر کاشمیری ایک صاحبِ مطالعہ اور صاحبِ بصیرت شاعر ہیں جن کی بین الاقوامی ادب اور فکری تحریکوں پر اچھی نظر تھی۔فیض کی طرح وہ بھی اپنے شعری سفر کو اُن طاقتوں کے خلاف پیکار قرار دیتے ہیں جو شرفِ انسانیت کا استحصال کر رہی ہیں۔ "عظمتِ آدم" کے پیش لفظ کا اختتام اِس جملے پر ہوتا ہے:

> "آج میری لڑائی اُن ہزار ہا دانشوروں اور فنکاروں کی لڑائی ہے جو اقتصادی اور تہذیبی طور پر انسان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔"(۲۱)

ظہیر کاشمیری نے "چراغِ آخرِ شب" کے پیش لفظ میں اپنے اِس موقف اور عزم کو ایک بار پھر دہرایا ہے۔ جس سے اُن کے عقیدہ کا استقلال ظاہر ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے شعری سفر کو اِسی عقیدہ سے تعبیر کیا ہے۔تاہم یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ "عظمتِ آدم" میں اُن کے ہاں فکری سطح پر وہ عمق نظر نہیں آتا جو "چراغِ آخرِ شب" کی نظموں میں ملتا ہے۔اس کے علاوہ اول الذکر مجموعے میں تکرار اور لفظیات میں سپاٹ پن سے بے مزگی کا احساس ہوتا ہے۔جبکہ ثانی الذکر کتاب میں فکری گہرائی کے ساتھ ساتھ اسلوب بھی عمدہ اور دلکش ہے۔اپنی نظم "آدم اور سانپ" میں وہ اس سانپ کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں جس نے آدم کو خدا کی غلامی سے نجات دی۔

چرخ سے پھینکے ہوئے اس دیوانے میں جوشِ جنوں اِس قدر تھا کہ اُس نے زمین کے مہیب و خاموش بیابان کو ایک سرسبز وشاداب خیابان بنا دیا۔کائنات کے جملہ عناصر کو اپنا محکوم کر کے انسان نے اپنے قوتِ بازو سے تزئینِ ہستی کی۔ظہیر کاشمیری کے ہاں یہ عنصر بہت دلفریب ہے کہ وہ انسان کا ذکر ایک عجیب سرشاری کے ساتھ کرتے ہیں۔اُن کے نزدیک انسان کا وجدان، آسمان کی فصیلوں پر محو پرواز رہا اور ستارے و سیارے، آفتاب و ماہتاب انسان کے اشاروں پر گردش کرنے لگے۔انسان کے تخلیقی وفور نے کائنات پر روز بروز نئے سے نئے امکانات وا کیے۔ظہیر کاشمیری کی نظم "آدمی نامہ" کے درج ذیل بند ملاحظہ ہوں:

میرے وجدان کا طائرِ بے صدا — آسماں کی فصیلوں پہ اڑتا رہا
ہر ستارہ مدارِ فضا چھوڑ کر — میرے عرفان کی سمت مڑتا رہا
آفتابوں کے سینے کی دھڑکن ہوں میں — ماہتابوں کے ماتھے کا زیور ہوں میں
گردبادوں کا زنجیرۂ رقص ہوں — بجلیوں کی نگاہوں کا تیور ہوں میں (۲۲)

انسان اپنے وجود میں آفاق کو صید کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔لیکن شومئ قسمت کہ بعض طاقتیں زمین پر ایسی رہی ہیں جن سے مغلوب ہو کر انسان کی یہ صلاحیتیں مجروح ہوتی رہی ہیں اور انسان کی وہ قوت زنگ آلود ہوگی جس سے وہ آفاق پر حاکمیت کر سکتا ہے۔ظہیر کاشمیری کے نزدیک غلامی زمین پر انسان کے لیے سب بڑی لعنت

ہے۔ اس لیے وہ آزادی کو انسان کا بنیادی حق خیال کرتے ہیں کہ جب تک انسان آزاد نہیں ہوگا اُس کی تمام تر صلاحیتیں زنگ آلود ہوتی رہیں اور انسان کا جوہر ظہور پذیر نہیں ہوسکتا۔ ظہیر کاشمیری کے نزدیک انسان زمین پر اِس لعنت کا سزاوار رہا ہے لیکن اُس نے غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ اُن کی نظم ''کہاں کا محمود کہاں کا ایاز'' اسی منظرنامہ کو لیے ہوئے ہے۔

زمین پر رہنے والے انسان، مساوی حقوق رکھتے ہیں اس لیے طبقاتی تقسیم نہایت غیر فطری ہے۔ ایک صاحبِ ثروت انسان کو جس طرح زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا استحقاق حاصل ہے جبکہ دوسری طرف معاشرے کا وہ انسان جو محنت کش ہے۔ وہ زندگی کی بعض بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے۔ ظہیر کاشمیری کے نزدیک یہی طبقاتی تقسیم ہے جو زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کے ابتلا کا سبب ہے۔ جب تک یہ دورِ غلامی باقی ہے انسان اپنے دکھ سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ اِس جہانِ کہنہ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور ایک جہانِ نو کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ اُس نئے انسان کے ظہور کی خواہش کرتے ہیں جو زمین پر انسانوں کی اس غیر فطری تقسیم کو ختم کر کے مساوی حقوق کا علمبردار ہو۔

یہ امر بہت دلچسپ و عجیب ہے کہ ظہیر کاشمیری طبقاتی تقسیم پر طنز کرتے ہوئے بھی غزنوی و ایاز کے استعاروں کے ذریعے بین السطور اقبال کو ہدفِ تعریض بناتے ہیں مگر آدمِ نو کے خواب کی تعبیر تلاش کرتے ہوئے انسانی مساوات نئے نظام کے ظہور پر سرشاری کا اظہار بھی اقبال ہی لفظوں میں کرتے ہیں۔ اپنی نظم ''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا'' میں اس آدمِ نو کی آمد پر وہ سرخوش و سرمست ہیں:

ہے آدمِ نو کی آمد آمد، ہجومِ رجعت بکھر رہا ہے
پرانی قدروں کا ہر محافظ خود اپنے سائے سے ڈر رہا ہے
زمیں پہ لرزہ ہوا ہے طاری، سروں سے پانی گزر رہا ہے
یہ انقلابِ امم کا لمحہ، رقم نیا باب کر رہا ہے
''جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مَر رہا ہے'' (۲۳)

جہانِ نو کے خواب اور اُن کی تعبیرِ حقیقی کی امید اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی حالتِ موجود میں انسان شدید کرب سے دوچار ہے۔ اس تناظر میں احمد ندیم قاسمی کی نظم کا جائزہ لیں تو وہ اُن اسباب و علل سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ جن کے باعث انسان آلام میں گھرا ہوا ہے۔ اپنی اصل میں انسان ایک ایسی ہستی ہے جسے قدرت نے رفعتوں سے نوازا ہے اور جس کے وجود میں امکانات کی ہزاروں کائناتیں آباد ہیں۔ انسان کے وجود ہی سے کائنات نے نمو پائی اور اس ہنگامہ زار کو رنگ و بو نصیب ہوئے۔ اس لیے کائنات کی بے کراں وسعتوں میں جو کچھ ہے۔ اس پیکرِ خاکی کے لیے ہے۔ انسان مالکِ بحر و بَر ہے اور کائنات کے خشک و تر پر دسترس رکھتا ہے۔ ''جلال و جمال'' کے دیباچہ میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''یہ ہماری زمین، یہ چاند کی محبوبہ، یہ خلا کی رقاصہ۔۔۔ جسے مشرق ومغرب نے ماں کے مقدس لقب سے یاد کیا۔ یہ ہمارا ازلی وابدی وطن۔ آخر ہم اس سے دور رہ کر صرف کارخانوں اور آمد وخرچ کے حسابوں اور مردم شماریوں وغیرہ میں کیوں کھو جائیں۔ یہ زمین اور ہوا، اور خلا سے پرے بے شمار دنیاؤں کی بے کنار خلائیں، یہ سب کچھ انسان کا ہے۔'' **(۲۴)**

انسان نے نہ صرف کا کلِ گیتی کو سنوارا بلکہ عناصر کائنات کو بھی خدا آشنا کیا۔ اس نے نہ صرف تزئینِ حیات کی بلکہ وہ ذات جو عینِ حیات ہے۔ اس سے بھی عناصرِ حیات کو آگاہ کیا۔ یعنی انسان کو اگر نہ پیدا کیا جاتا تو تمام موجودات اپنے خالق سے بے خبر رہتے اور خدا کی پہچان کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔ انسان نے اپنی تخلیق کے بعد نظامِ کائنات کو منقلب کر دیا اور ہر شے کی کایا پلٹ دی۔ زمین پر موجود عناصر جو خدا سے بیگانہ تھے۔ انہیں خدا سے شناسا کیا۔ دوسرے لفظوں میں انسان کی تخلیق سے پہلے خدا کا وجود زمین پر نہ ہونے کے مترادف تھا کہ یہاں اس کا کوئی شناسا ہی نہ تھا۔ سو انسان نے وجود پانے کے بعد زمین اور خدا میں تعلق استوار کیا اور وہ خدا جو عرش نشیں تھا اسے فرش پہ لے آیا۔ قاسمی اپنی نظم ''انسان عظیم ہے'' میں یہی احساس خدا کو دلاتے ہیں:

ممتاز حسین نے شعلۂ گل کے دیباچہ میں احمد ندیم قاسمی کی اِس نظم کے حوالہ سے لکھا ہے:

''یہاں احمد ندیم قاسمی کی فکر علامہ اقبال کی فکر سے زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔'' **(۲۵)**

ممتاز حسین کے اس تنقیدی دعوے پر فتح محمد ملک کا یہ تبصرہ قطعی طور پر درست ہے کہ

''یہ محض اُن کی خوش فکری ہے جو ترقی پسند نظریۂ ادب سے وفاداری بشرطِ استواری کی دلیل ہے''۔ **(۲۶)**

ممتاز حسین کی خوش فکری اپنی جگہ لیکن شاعر کو اپنی فکر کی ترسیل کے لیے اپنے اسلوب پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اگر انسان اتنا ہی عظیم ہے تو خدا سے مخاطب انسان کے لہجے میں وہ اعتماد بھی ہونا چاہیے جو عظمت پر متمکن کسی ہستی کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اقبال جب ''یزداں بکمند آور'' یا ''دامنِ یزداں چاک'' کا نعرۂ مستانہ لب پر لاتا ہے تو اُس کے اندازِ گفتار میں وہ طنطنہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ جو خدا سے مقابل ہونے کے لیے چاہیے۔ جبکہ احمد ندیم قاسمی کا لہجہ اتنا گھگھیایا ہوا ہے کہ لگتا ہے جیسے خدا سے فریاد کر رہا ہے۔ ایسے میں یہ خوش فہمی کہ احمد ندیم قاسمی کی فکر اقبال سے بلند ہوگئی ہے، قدرے مضحکہ خیز لگتی ہے۔ کم وبیش ایسا ہی لب ولہجہ قاسمی کی نظم ''مجاز'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

انسان کی ذلت اور رسوائی میں صرف ''شائبہ، خوبیٔ تقدیر'' ہی نہیں۔ بلکہ زمین پر کچھ طبقے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے مفاد کے تحفظ کی خاطر زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی تقدیر سے کھیل رہے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا ایمان محض ہوسِ زر ہے۔ جو اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے لاکھوں انسانوں کی جان سے کھیلنا بھی جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ طبقہ ہے جسے ''پیرانِ کلیسا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خالق ومخلوق کے درمیان پردے حائل رکھتے ہوئے وہ اس فکر کی ترویج واشاعت میں رہتا ہے کہ آدمی سے خدا بہت دور ہے اور بقول جمیل ملک:

''یہ لوگ کشف وکرامات کے ذریعے عرشِ بریں کی خبر لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن

> اس انسان کو بھول جاتے ہیں جس کی صورت گری خدا نے اپنے جلال و جمال سے کی ہے اور جو اس کا شہپارۂ تخلیق ہے۔''(۲۷)

یہ طبقہ خدا کو بہت عظیم مگر انسان کو نشیب کا کیڑا خیال کرتا ہے۔ قاسمی کے خیال میں یہ وہ تصور ہے جو انسان کے ذہن میں بٹھا دیا گیا ہے۔ جس کے باعث وہ روز بروز شعوری و لاشعوری طور پر احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا ہے اور اپنے اس احساسِ کمتری کا علاج تلاشنے کے لیے وہ اپنی راہ اور اپنے مقام سے بھی بھٹک گیا ہے۔ اپنی پہچان کی خاطر مختلف حوالوں سے انسان تقسیم ہو رہا ہے۔ اس حوالہ سے ان نظم ''آشوب'' قابلِ ذکر ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے نزدیک زمین پر انسان سے انسان کا بُعد صرف اِس صورت میں ختم ہو سکتا ہے کہ انسان، انسان سے محبت کرے کہ یہی اس کا منصب ہے۔ ندیم انسانی زندگی کو عشق کرنے کا بہترین وقت قرار دیتے ہیں لیکن افسوس انسان اس لمحے کو ضائع کر رہا ہے۔ ندیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان ایک دوسرے سے کدورت کا شدید جذبہ رکھنے لگا ہے۔ اور اب سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے۔ انسان اس قدر جذباتی ہو گیا ہے کہ ''جنگ'' کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے۔ ندیم اپنی نظم میں یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو انسان سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اب وہ قیامت کاٹے گا اور انسان ایک دن اپنی تباہی کا خود باعث بنے گا۔ ندیم یہ آرزو کرتے ہیں:

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار/ چار سو ایک تبسم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری/ توپ ہو روئے زمیں پر، نہ فضا میں بمبار
لاکھ طوفان اٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں/ عشق چاہے تو شجر کیا، کوئی پتہ نہ ہلے
آدمیت کا جو منصب، اسے پہچانو/ اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو!(۲۸)

انسان کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا نقطۂ نظر اپنے معاصر اور ہم خیال شعرا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لیکن اپنی تخلیقات میں انھوں نے انسان کو خیر کی علامت کے طور پر دیکھا ہے اور اسی میں وہ حسنِ بشر کے تلاشی بھی ہیں۔ بقول محمد علی صدیقی:

> ''قاسمی انسان کو تجرید و تجسیم دونوں صورتوں میں امکاناتِ خیر و برکت کا پتلا سمجھتے ہیں۔ انسان ان کے یہاں ایک جمالیاتی صوت و صورت و آہنگ بن کر ابھرتا ہے۔''(۲۹)

ترقی پسند تحریک کے شعرا پر اس لحاظ سے بہت تنقید ہوئی کہ انھوں نے شعر کی جمالیات پر کچھ زیادہ توجہ نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اتفاق یا اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے لیکن اُن کے منشور میں زندگی کی ابدی جمالیات کا آدرش یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ جمالِ حیات کے معنی سے آگاہ اور اس کے تلاشی و داعی تھے۔ ان شعرا کے تصورِ انسان میں بھی یہی زاویۂ نظر غالب ہے۔ اپنی منظومات میں ترقی پسند شعرا نے زندگی کے اصل مسائل سے آگہی کو اولین ترجیح دی۔ طبقاتی شعور کو اجاگر کیا اور اپنے تخلیقی سفر کے ہر پڑاؤ پر انسانی مساوات و عظمت کی اشاعت کی۔

اِس تحریک سے وابستہ شعرا نے اشرافیہ کے ساتھ ساتھ مذہبی اشرافیہ کو بھی ہدفِ طنز بنایا اور نہایت بے

باک انداز میں ان کے باہمی مفادات اور سازشوں سے پردہ اٹھایا۔ یہی وہ زاویۂ نظر ہے جب ترقی پسند شعرا اور دانشور فکر اقبال سے بھی غیر ضروری طور پر الجھ پڑے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اہلِ قلم اقبال کے بارے میں کچھ زیادہ واضح نہیں تھے۔ وہ اقبال کو مذہبی اشرافیہ کا علمبردار بھی سمجھتے تھے مگر جہاں اقبال اور اپنے مابین فکری اشتراک دیکھتے تو اُن کی مدّاحی بھی کرتے تھے۔

مجموعی طور پر انسان کے بارے میں ترقی پسند شعرا کا زاویۂ نظر سماجی لحاظ سے ایک بہت بڑی حقیقت پر مبنی تھا۔ ان شعرا نے جس عہد میں ایک خاص آدرش کو سامنے رکھتے ہوئے نظم لکھی اُس کے تناظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سماجی شعور کی بیداری کے لیے ترقی پسند سرمایہ نظم نے ذہن انسانی کے درواکرتے ہوئے اردو نظم کے فکری تسلسل میں ایک اہم اور نیا باب رقم کیا۔

حوالہ جات

۱۔ جوش ''الہام وافکار''لا ہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۶ء، ص ۱۵۵

۲۔ جوش، ''آیات ونغمات'' ص ا

۳۔ سلیم احمد ''ادھوری جدیدت''، کراچی، سفینہ اکیڈمی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۵۰

۴۔ محمد حسن، ڈاکٹر، مضمون ''فکرِ جوش''، ''جوش ملیح آبادی۔ خصوصی مطالعہ'' (مرتبہ: قمر رئیس)، دلی، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱

۵۔ عقیل احمد، ڈاکٹر، ''جوش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' دلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۸

۶۔ جوش، ''عرش وفرش''، ممبئی، کتب خانہ تاج، ۱۹۴۴ء، ص ۵۷

۷۔ ایضاً، ص ۵۷ ۸۔ جوش، ''الہام وافکار'' ص ۳۰ ۹۔ قمر رئیس، ''جوش ملیح آبادی۔ خصوصی مطالعہ''، ص ۱۰۶۔۱۰۵

۱۰۔ جوش ''الہام وافکار'' ص ۱۷۷ ۱۱۔ جوش، ''جنون وحکمت'' لاہور، مکتبہ اردو، س ن، ص ۳۷

۱۲۔ جوش ''الہام وافکار''، ص ۵۴ ۱۳۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۱۴۔ فیض احمد فیض ''لینن امن انعام کی تقریب میں فیض کا خطبہ'' نسخہ ہائے وفا، دلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۴

۱۵۔ ''نسخہ ہائے وفا''، ص ۹۰ ۱۶۔ ایضاً، ص ۱۶۳ ۱۷۔ ایضاً، ص ۶۳۷ ۱۸۔ ایضاً، ص ۶۳۹

۱۹۔ سابق میجر محمد اسحاق، ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۱۰۷ ۲۰۔ ''نسخہ ہائے وفا'' ص ۲۳۰

۲۱۔ ظہیر کاشمیری، ''عظمتِ آدم'' لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰

۲۲۔ ظہیر کاشمیری، ''چراغِ آخرِ شب'' لاہور: مکتبہ کاروان، ص ۲۔۱۴۱ ۲۳۔ ''چراغِ آخرِ شب'' ص ۱۔۷۰

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''جلال وجمال''، لاہور: التحریر ۱۹۶۹ء (بار دوم) ص ۳۳ ۲۵۔ ممتاز حسین، دیباچہ ''شعلہ گل'' ص ۱۹

۲۶۔ فتح محمد ملک، ''احمد ندیم قاسمی کا آدمِ نو'' افکار (ندیم نمبر) ص ۴۰۶

۲۷۔ جمیل ملک ''رباعی کی چار دیواری اور ندیم''، ''ندیم نامہ'' (مرتب محمد طفیل۔ بشیر موجد) ص ۲۵۷

۲۸۔ احمد ندیم قاسمی، ''محیط'' لاہور: التحریر، ۱۹۷۸ء (بار دوم) ص ۱۲۳

۲۹۔ محمد علی صدیقی، ''توازن'' کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۷۶ء، ص ۲۳۹